دورِ ملوکیت میں فقہ و فتاویٰ کیسے مرتّب ہوئے، اس کی حقیقت ایک جیدعالم اور فقیہہ کی شہادت سے پیش کرتے ہیں :

فتاویٰ جہانداری

کتبِ فتاویٰ کیسے مرتّب ہوئیں! برِّصغیر پاک و ہند کے ماحول کے پس منظر میں اس کی مکمل ترین تشریح جیّد عالم، نامور مؤرخ اور ممتاز محقق ضیاء الدین برنی کی "فتاویٰ جہانداری" میں ملتی ہے۔ فتاویٰ جہانداری فیروزشاہ تغلق کی حکومت کے پہلے چھ برسوں میں مرتّب ہوئی تھی۔ فتاویٰ کی اس کتاب کے اہم اور بنیادی نکات یہ ہیں :

"برنی نے رسولِ خدا اور خلفاء کی روایات اور معمولات کو یہ کہہ کر برطرف کر دیا ہے کہ یہ اصول ایک ایسے دور کی یادگار ہیں جو محض وقتی تھی اور جس کا دوبارہ ظہور میں لانا اس لیے ناممکن ہے کیونکہ وہ ایک مثالی چیز تھی اور تبدیل شدہ حالات میں اس کے حصول کی کوشش بے سود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر خدا کی طرف سے وحی آتی تھی اور خلفائے راشدین کو انہوں نے تربیت دی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو واقعات گذر گئے ہیں ان کی تکرار ناممکن ہے۔ جہاں داری چونکہ حکمران طبقہ کا حق ہے اس لیے سماجی نظام کو وراثت کے ذریعے برقرار رکھنا ضروری ہے جہاں تک مسلمان عوام کا تعلق ہے ان کی جگہ معیّن ہے۔ علماء کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ عوام کو دینی رسوم مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے ماوراء کوئی تعلیم نہ دیں۔ رہے وہ لوگ جو محکوم ہیں اور اسلام قبول کر چکے ہیں مثلاً ہندو اور منگول ان کی طرف توجہ کی چنداں ضرورت اس لیے نہیں ہے کیونکہ توحید کا تصور جسمانی طور پر انہیں ورثہ میں نہیں ملا ہے اور نہ اس قسم کا کوئی عقیدہ ان کے خون میں جاری و ساری ہے۔ آگے چل کر برنی کہتا ہے نہ تو ہم میں وہ مسلمان باقی ہے اور نہ ہمیں وہ مسلمان میسر ہیں جن پر ہم ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح حکومت کر سکیں۔ اپنی دلیل کو مستحکم کرنے کے لیے برنی کہتا ہے کہ ہم اس واقعہ کو نظرانداز نہ کریں کہ چار خلفاء میں سے جنہوں نے رسول کے بتائے ہوئے رستہ پر چلنے کی کوشش کی تین کو صرف اس لیے شہید کر دیا گیا کیونکہ وہ حکمرانوں کی طرح اپنا ذاتی تحفظ غیر ضروری سمجھتے تھے۔"[1]

---

[1] خلیق احمد نظامی 'تاریخ مشائخ چشت' تعارف از محمد حبیب صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۱۹۵۲ء صفحات ۲۲، ۲۴

© rasailojaraid.c

©-rasailojaraid.c

ڈاکٹر صاحب کے ان افکارِ عالیہ کے مطالعے کے بعد ان سے گذارش کی جاسکتی ہے کہ دعوت الی القرآن کی جس عظیم تحریک کے وہ علمبردار ہیں اس کا تقاضا ہے کہ گذشتہ تفاسیر کی ظاہریت پر قناعت نہ کی جائے۔ تفاسیر اور روایات بھی فقہی احکام و قوانین کی طرح ملوکیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی تھیں۔ قرآن کی ہر آیت اور قولِ رسولؐ کی ہر حدیث پر ان کے غلاف موجود ہیں۔

اس عرضداشت پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ جو مفکر عقاید و عبادات کو انسانی حقوق، اختیارات اور معاملات کے ساتھ مربوط کر کے پیش کرتا ہے۔ اس کی تحریک کو خلق خدا کی دعائیں تیز تر کر دیتی ہیں۔ عوام کے اخلاق اور ان کے حقوق و اختیارات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپ نے ایمانیات اور معاشی، سماجی اور سیاسی حقوق کو مربوط کر کے پیش کیا تھا۔ توحید کی وضاحت اخوت، مساوات، حریت اور جمہوریت کی اصطلاحات سے کی تھی۔ جو عام بدو کو بھی سمجھ میں آسکتی تھی۔ رزق کے وسائل کو خالق کی طرف سے مخلوق کے لیے مساوی طور پر بیان کیا تھا۔ دورِ حاضر میں اب ان عقائد کو زیادہ آسانی کے ساتھ بہت جلد عام کیا جاسکتا ہے کیونکہ اب عوام خود بیدار اور باشعور ہیں۔ اس وقت انہیں بیدار بھی کرنا پڑتا تھا اور انہیں حقوق کا شعور بھی دلانا پڑتا تھا۔ ہر دور میں دعوت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک دور کا طریق دعوت اپنے دور کے تہذیبی، سماجی، نفسیاتی اور تمدنی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ میری رائے میں دعوت الی القرآن کی تحریک کو اس وقت پر لگ جاتے ہیں جب اللہ کے عطا کردہ حقوق کے حوالے سے ایمانیات، عقاید اور عبادات کو پیش کیا جائے، اور عوام " یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا " کے مصداق فوج در فوج دین کے غلبے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انسانی حقوق، آئینی ریاست، قانون کی حکمرانی، شہری آزادیاں عقاید کو متحرک اور فعال بنا دیتی ہیں وہ ان کے بغیر جمود، تعطل اور تقلید کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں آخر پہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اس عظیم شاہکار کی تخلیق پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے بر وقت قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنی دعوت الی القرآن کو بنیاد بنا کر انسانی حقوق، شہری آزادیوں، قانون کی حکمرانی اور آئینی اور قانونی ریاست و حکومت کے اسلامی تصورات کے ساتھ مربوط کر کے اس تحریک کے فیوض، برکات اور ثمرات کو عوام الناس تک عام کرنے کی جد و جہد کو تیز تر فرمائینگے۔

© rasailojaraid.com

دعوت اِلیٰ القرآن — چند تأثّرات

چوہدری مظفر حسین

بہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام

محاضراتِ قرآنی (مارچ ۹۰ء)

کے موقع پر پیش کیا گیا

میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے حسب معمول اس سال بھی محاضرات قرآنی میں مجھے مدعو کیا۔ یہ ان کی وضع داری اور ذرہ نوازی ہے کہ ایسے مواقع پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور سے ارادت مندی کے حوالے سے مجھے یاد فرماتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ راقم اپنی علمی فرومائیگی کے باعث ایسی علمی مجالس میں باریابی کا اہل نہیں۔ یہ محض ان کا الطاف خسروانہ ہے کہ اس ہیچمدان کو بھی وہ ان مجالس میں طلب فرما لیتے ہیں۔

گزشتہ سالوں کے محاضرات سے اس سال کے محاضرات اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اس میں ارتکازِ مباحث خود ڈاکٹر صاحب کی ایک تالیف کے مندرجات اور مشمولات پر ہے جس کا موضوع خطۂ برصغیر پاک و ہند میں دعوت رجوع الی القرآن کی تاریخ ہے۔ موجودہ محاضرات کی حیثیت چونکہ ایک طرح سے اس کتاب کی تقریب رونمائی کی سی ہے۔ اس لئے میرے لئے مشکل پیدا ہو گئی ہے کیونکہ میں اِدھر اُدھر کی گپ شپ لگا کر کام چلانے کا عادی ہوں۔ لیکن موجودہ صورت میں تو جو بھی معروضات پیش کی جائیں گی انہیں تبصرۂ کتاب پر محمول کیا جائے گا۔ تبصرہ نگاری ایک مشکل کام ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تبصرہ نگاری کی مروجہ شکلوں میں سے ایک آسان شکل یہ بھی ہے کہ تاثراتی بیان و اسلوب سے بھی کام چل جاتا ہے۔ اسی آسانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں یہاں محض اپنے تاثرات بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب سے میری یک طرفہ شناسائی کالج کے زمانے میں ہوئی جن دنوں آپ نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے سال اول میں داخلہ لیا۔

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

میں بھی بی-ایس-سی کے طالب علم کی حیثیت سے اس کالج میں اناٹومی اور فزیالوجی کے مضامین کا طالب علم تھا اور میرا کورس قریب الاختتام تھا- مجھے یاد ہے کہ ایک نووارد کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی شہرت ایک نہایت ذہین اور ہونہار طالب علم کی تھی، جس میں ہمارے لئے خوشی کی بات یہ تھی کہ یہ اسلامی جمعیت طلبہ کے بھی رکن تھے- میں ان سے پوری طرح متعارف بھی نہیں ہو پایا تھا کہ بی-ایس-سی کے امتحان سے فارغ ہو گیا- لیکن بعد میں اولاً جمعیت اور بعدہٗ جماعت کے رکن کی حیثیت سے ان کا غائبانہ ذکر دورانِ ملازمت بھی سنتا رہا- ماچھی گوٹھ کا دھماکہ خیز اجتماع جماعت کے ہر رکن اور ہمدرد کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھا اور اس کے نتیجے میں جن اراکین نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی ان میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا بھی نام سنا گیا-

بعد میں جماعت چھوڑنے والے تمام لوگوں میں سے ڈاکٹر صاحب موصوف جماعت اسلامی کے شدید ترین نقّاد کی حیثیت سے ابھرے- اس طرح ان کا اپنا تشخّص تو نمایاں سے نمایاں تر ہوتا گیا لیکن جماعت اسلامی ایک اعلیٰ قائدانہ صلاحیت رکھنے والے رکن سے محروم ہو گئی- راقم آج بھی کھلے عام اپنی اس کم فہمی کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کے باوجود اختلافات کی اس گہرائی تک کبھی رسائی حاصل نہیں کر سکا جس نے شخصیات کے ٹکراؤ کی ایسی صورت پیدا کی کہ اکابرین جماعت ایک دوسرے سے بیزار ہو گئے- راقم آج بھی دیانت داری سے یہی سمجھتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جماعت اسلامی کی تنظیم اور مولانا مودودی کی شخصیّت کو وقتاً فوقتاً نشانۂ تنقید بنا کر کوئی مفید خدمت انجام نہیں دی- البتہ جماعت سے ان کی علیحدگی کا ایک مثبت نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصے کے لئے سیاسی سرگرمیوں سے کٹ کر ہمہ تن قرآن حکیم کے مطالعہ میں مستغرق ہو گئے اور تعلّم و تعلیم قرآن کے سلسلے میں ایک نہایت شاندار کارنامہ انجام دیا- ڈاکٹر صاحب موصوف کا کوئی کٹّر سے کٹّر مخالف بھی ان کی ان خدمات سے انکار نہیں کر سکتا- خود ڈاکٹر صاحب اپنے اس کارنامہ سے اس حد تک مطمئن ہیں کہ ان میں نفسِ مطمئنّہ کی ایک پیشگی جھلک محسوس ہوتی ہے- فرماتے ہیں:

"عالَمِ آخرت سے قریب تر اور عالمِ دنیا سے ذہناً اور قلباً بعید اور منقطع محسوس کرتا ہوں- جب کبھی تنہائی میں اپنی گزشتہ زندگی خصوصاً اس

© rasailojaraid

کے چالیس سالہ شعوری دور پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اولاً تو نہ صرف یہ کہ اپنے باطن میں نہایت گہرے سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ ع
"جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے"۔ بلکہ قلب و روح کی سر زمین پر ایک جانفزا فرحت اور مسرت آمیز انبساط کی تسکین بخش پھوار سی محسوس ہوتی ہے کہ ع
"شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم"

اگر کوئی صاحبِ ایمان جیتے جی اپنی زندگی سے اس حد تک مطمئن ہو تو اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ جب راقم نے یہ سطور پڑھیں تو پیمانۂ دل جذبۂ رشک سے چھلک چھلک گیا۔ آنکھیں نمناک ہوئیں اور ایک آہ سوزناک دل سے اٹھی واحسرتا میرے بھی نامۂ اعمال میں کوئی ایسی بات ہوتی۔
ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحریر کا یہ منفرد اسلوب ہے کہ اپنی قبائے تحریر میں تاریخ و حکمت کے ساتھ ساتھ اپنی سر گزشت بھی تارِ حریرِ دو رنگ کی طرح بُنتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ جب بعض شخصیات کا ذکر کرتے ہیں تو ان سے وابستہ تلخ یادوں کو دہرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جن کی وجہ سے ان کی زبانِ قلم کا ذائقہ کہیں کہیں کڑوا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ مصنف کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کس بات کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور وہ اسے ضبطِ تحریر میں لانا کس حد تک ضروری یا ناگزیر خیال کرتا ہے۔ لیکن ایک قاری کی حیثیت سے اگر مجھے اپنا تاثر بیان کرنے کا حق دیا جائے تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس تصنیف میں ایسی باتوں کو بیچ میں نہ ہی لایا جاتا تو بہتر تھا۔ اے کاش! فصل کی بجائے وصل کی روش کو اپنایا جاتا۔ اختلافات کی باتیں ایک بار جب ضبط تحریر میں آجاتی ہیں تو مستقبل میں بھی وصل کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی وساطت سے بڑھے اور وہ بھی ڈاکٹر رفیع الدین کی زندگی میں کم اور ان کی وفات کے بعد زیادہ۔ جن دنوں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم لاہور میں تھے ڈاکٹر اسرار احمد اور راقم سے ان کی اکثر ملاقاتیں رہتیں اور ڈاکٹر اسرار صاحب کا ذکر وہ بڑی محبت سے کرتے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کی وفات کے بعد شرکتِ غم سے ڈاکٹر اسرار صاحب سے میری [illegible] وہ زمانہ تھا کہ وہ اپنے حلقہ ہائے دروسِ قرآن میں پوری

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

طرح منہمک تھے اور ان کے درس قرآن کی دھوم مچی ہوئی تھی- مسجد خضراء میں ان کا درس سننے کے لئے دور دور سے لوگ آتے جو ہر اتوار کو ہوتا تھا- مسجد خضراء کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر وہ درس دیتے تھے- بلکہ جہاں جہاں سے بھی دعوت ملتی بلاحیل و حجت وہاں تشریف لے جاتے- چند درس انہوں نے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کے دفتر میں بھی دیئے- اس دوران مختلف مقامات پر دوسرے علماء کے بھی درس ہوتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو مقبولیت ڈاکٹر اسرار صاحب کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصہ میں نہ آئی-

قرآن حکیم سے امت مسلمہ کی مہجوری کے اسباب چند تاریخی عوامل ہیں جن کی نشان دہی انہوں نے بڑے ہی فکر انگیز لیکن سادہ بیان میں کی ہے- وہ فرماتے ہیں :

"جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور ایمان کی بجائے اسلام پر 'یقین' کی بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا- نتیجتہً قرآن حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور یکے از ادلۂ اربعہ ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجہ بنتی چلی گئی اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی، قرآن مجید چار میں سے ایک کی حیثیت سے پس منظر میں گم ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں- ستم بالائے ستم یہ کہ علم و حکمت کے میدان میں اس طرح جو خلاء پیدا ہوا اسے پُر کرنے کے لئے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں- نتیجتہً پورا عالم اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی تصوف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا- یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لئے مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبعِ ایمان رہا، نہ سرچشمۂ یقین، نہ مخزنِ اخلاق اور نہ معدنِ حکمت-"

لیکن دور حاضر میں امت مسلمہ کی قرآن حکیم سے مہجوری کا سبب وہ "تعبیر

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

کی غلطی" کو ٹھہراتے ہیں جسے وہ احیائے اسلام کی تحریکوں کی سوچ اور طریق کار پر فکر مغرب کے غلبے یا اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں- یہی غلطی بالآخر تصورِ دین کی اس خامی اور مطالعۂ دین سے نقص پر منتج ہوتی ہے- تصور دین کی اس خامی کے تحت دین اسٹیٹ کا ہم معنی قرار پاتا ہے- عبادت اطاعت کا مترادف ہو کر رہ جاتی ہے- صلوٰۃ معاشرے کی اصلاح و تنظیم ' زکوٰۃ معیشت کا ستون' روزہ ضبط نفس کی مشق اور حج ایک عالمگیر برادری کے احساس کی شکل-" یہ نئی تعبیر براہ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلّط کا جس نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ اور مادہ پرستانہ بنادیا ہے- اور اس کے نتیجہ میں روح اور حیات باطنی خارج از بحث ہو گئی اور اسلام محض ایک سیاسی و عمرانی نظام بن کر رہ گیا-"

سید صاحب کے فکر، تصوف و روحانیت کی طرف ان کے واضح جھکاؤ کا پتہ دیتے ہیں- جس کی پر زور توثیق ان کی مندرجہ ذیل تحریر سے ہوتی ہے:

"عوام کی کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربّانی اور نورِ ایمانی سے منور، سینے کبر' حسد' بغض اور ریا سے پاک' زندگیاں حرص' طمع' لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں- خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کی تبلیغ و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے- اور جب سے مغرب کی الحاد و مادہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا' ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ایسی شخصیتیں ابھی بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے دل روشن' نورِ یقین اور نفس گرم حرارت ایمانی سے معمور ہیں اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحبِ عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضاجوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو-"

ایسی تمام تحریریں تصوف کی طرف ان کے قوی رجحان کو ظاہر کرتی ہیں-

© rasailojaraid

لیکن مکاتیب تصوف میں جس مکتب کے لئے ان کے دل میں کشش پیدا ہوئی وہ تبلیغی جماعت ہے - جسے تصوف کی عام اصطلاح میں سلسلہ ہی شمار نہیں کیا جاتا- لیکن اس سلسلے سے بھی وہ اپنے آپ کو پوری طرح ہم آہنگ نہیں پاتے اور اس میں انہیں خامی یہ نظر آتی ہے کہ اس میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے - اس لئے اس کے اثرات صرف معاشرے کے اس طبقے تک محدود ہیں جن کے یہاں جذبات پر عقل اور علم پر عمل کو اولیت حاصل ہے - جبکہ غلبہ دین کے کام میں معاشرے کی اس ذہین اقلیت کو سب سے زیادہ متاثر کرنے کی ضرورت ہے جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں -

علامہ اقبال نے بھی تصوف کے مرّوجہ سلاسل کو قرونِ وسطیٰ کی پیداوار قرار دیا تھا- جس نے اسلامی تفکر کی اصل روح کو کچل کر مسلمانوں کا رخ باطنی واردات پر مرتکز کر دیا چنانچہ ذہین لوگ تصوف کی طرف مائل ہو گئے اور کاروبار سلطنت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آیا جو ادنیٰ درجے کی صلاحیتوں کے مالک تھے - علامہ اقبال کے نزدیک اسلام اب چونکہ جدید تفکر اور تجربہ کے دور میں داخل ہو چکا ہے، اس لئے اب کوئی ولی اور پیغمبر بھی اس کا رخ قرونِ وسطیٰ کے تصوف کی تاریکیوں کی طرف نہیں موڑ سکتا-

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ موجودہ دور کا انسان "محسوسات پر مبنی تفکر" (Concrete Thought) کا عادی ہو چکا ہے اور اسے اب ایک ایسی قسم کا تصوف درکار ہے جو عشق و عقل کی آمیزش سے معرض وجود میں آئے - علامہ کے نزدیک جنوں کی قبا قامتِ خرد کے لئے بالکل موزوں ہے اور وہ رسم فرزانگی کو ذوقِ جنوں بخش سکتی ہے -ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی اس قسم کا "رسوخ فی العلم" پیدا کرنے کے متمنی ہیں جو تقویٰ اور خشیتِ الٰہی پر منتج ہو - یہی ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور کی تمنا اور آرزو تھی - جس کے لئے انہوں نے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کی داغ بیل ڈالی اور یہی کرنے کا وہ اصل کام ہے جس کے لئے ڈاکٹر اسرار صاحب نے قرآن اکیڈمی کی بنیاد رکھی - "ایک جدید علم الکلام کی تاسیس" "ایک نئی تہافت کی تصنیف" اور قرآن حکیم کی روشنی میں "جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلل تنقید" سبھی

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

نہایت ہی مبارک کام ہیں لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ایسے کاموں کے لئے امت مسلمہ کو کبھی کبھار اکادکا شخصیات تو میسر آتی رہی ہیں لیکن ایسے مہتم بالشان کاموں کے لئے مستقل ادارے کبھی معرض وجود میں نہیں لائے جاسکے اور اگر کبھی قائم بھی ہوئے تو وہ زیادہ دیر چل نہ سکے - علامہ اقبال مطالعہ قرآن کے اصولوں پر اپنی کتاب لکھنے کی آرزو دل ہی دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور امت مسلمہ کی حیاتِ مستقبلہ کے مسائل پر تحقیق و تدقیق کا وہ منصوبہ جو ان کی وفات کے بعد 'دارالاسلام' کے نام سے مولانا مودودی کے زیر سایہ منصّۂ شہود پر آیا' سے لے کر ڈاکٹر اسماعیل الفاروقی کے ادارہ انٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ تک معاملہ نتائج کے اعتبار سے ایک سا ہی رہا ہے - تاہم ہماری دعا ہے کہ قرآن اکیڈمی کا منصوبہ کامیابی سے پروان چڑھے اور خوب پھلے پھولے - آمین -

ڈاکٹر صاحب نے اپنی دعوت الی القرآن کے ضمن میں بعض سلاسل کے ذکر کے ساتھ ساتھ ایک شخصیت پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا ذکر بھی کیا ہے لیکن وہ ڈاکٹر برھان احمد فاروقی کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب سے کہیں زیادہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کا ذکر کیا جاتا - جنھوں نے 'منہاج القرآن' جیسی وقیع کتاب تصنیف کی ہے - اس کتاب سے دور جدید کے انسان کے لئے قرآن فہمی کی نئی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں - اس کتاب میں مطالعہ قرآن کا ایک منہاج اور قرآنی طریقہ انقلاب کی تکنیک کا بیان بھی ملتا ہے - مگر حیرت ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی پوری کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی اس تصنیف کا کہیں ذکر تک نہیں کیا - حالانکہ "مولوی عبداللہ چکڑالوی کی چکڑالویت 'محمد علی لاہوری کی لاہوریت 'علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیت اور چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیت تک" ان کے شمار میں ہیں - مانا کہ ڈاکٹر برھان احمد فاروقی کے فکر کی شاخ کسی معروف شجرِ شخصیت سے نہیں پھوٹی - مانا کہ ڈاکٹر صاحب کا اسلوبِ بیان فلسفیانہ اور زبان دقیق ہے - پھر بھی ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب میں ایسے بصیرت افروز نکتے ملتے ہیں جو گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں - وائے ناقدریٔ زمانہ کہ بقول کالم نویس عطاء الحق قاسمی ڈاکٹر برھان احمد فاروقی وہ غریبِ شہر ہیں جو شہرِ علم میں اپنے علم کی

© rasailojaraid
© rasailojaraid